عابد رضا بیدار

انسانی عقل کی آخری حد اور اس کے بعد

مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک خط

مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات کے بعد ان کے متعدد غیر مطبوعہ خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ ذیل کا خط بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ خط بہت اہم ہے بلکہ ایک لحاظ سے مولانا کے جو دو چار اہم ترین خط ہو سکتے ہیں، ان میں سے ہے۔ اس خط میں کئی جگہ مولانا کی مخصوص طرزِ انشاء کے بڑے دل کش نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ ''شہابِ ثاقب'' کی بحث کے دوران میں جو نکات جس لطیف پیرائے میں بیان کیے ہیں، یہ حصہ مولانا کی اہم ترین تحریروں میں سمجھا جانا چاہیے۔ مولانا کے بقول ''مختصر لفظوں میں جو کچھ کہہ دیا گیا ہے، اگر آپ غور کریں گے تو نصف قرآن کی تفسیر ہے۔'' یہ خط ۱۹۲۰ء کا لکھا ہوا ہے اور اس لحاظ سے مولانا آزاد کے قدیم ترین خطوں میں بھی ہے۔

یہ خط میرے محترم استاد جناب مولوی ضیاء اللہ خاں صاحب رامپوری کے نام ہے اور ان کے پاس محفوظ ہے۔ مولوی ضیاء اللہ خاں صاحب رامپور صولت پبلک لائبریری کے صدر ہیں۔ یہ لائبریری اپنی ۴۵-۵۰ ہزار کتابوں کے باعث ممتاز ترین مشرقی لائبریریوں میں ایک ہے۔ مولانا کی عمر ۹۰ کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ فرماتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۲ء میں جامع مسجد رامپور میں تقریر کی تھی۔ اس وقت ان کے ڈاڑھی مونچھیں کچھ نہ تھیں۔ اسی تقریر سے مولانا آزاد سے اُن کا تعارف ہوا۔ اور اس کے بعد ہی اُنہوں نے مولانا آزاد کو وہ خط لکھا جس کا جواب یہ ہے:

سوالات جن کے جواب میں یہ خط لکھا گیا ہے۔ پہلے کو چھوڑ کر (جس میں عربی سیکھنے کے

لیے ابتدائی کتابوں کے نام پوچھے تھے، جو مولانا کی نظر میں مناسب ہوں) باقی سب سماوی قسم کے ہیں۔ اس خط کی اشاعت کے لیے مَیں استاذی المحترم قبلہ ضیاء اللہ خاں صاحب کا شکر گزار ہوں۔ [عابد رضا بیدار]

۱۱۔ بالی گنج، سرکلر روڈ، کلکتہ

۲۔ اگست ۱۹۲۰ء

حمّی فی اللہ۔ السلام علیکم! خط پہنچا۔ جن تعلیمی رسائل کے متعلق مَیں نے دہلی میں ذکر کیا تھا۔ وہ حسب ذیل ہیں:

القراۃ الرشیدہ، جزاوّل سے جزو چہارم تک، مطبوعہ قاہرہ۔

فوائد الانشاء۔ اوّل وثانی، مطبوعہ قاہرہ۔

هداية الطالب الى قواعد العربية، اوّل وثانی، مطبوعہ قاہرہ۔

مبادیات کے لیے یہ سلسلہ مفید ہوگا۔ آپ نے لکھا ہے کہ مَیں یہ رسائل بھیج دوں۔ اگر مَیں یہ بھیج سکتا تو تحفتہً بھیج دیتا۔ لیکن میرے کتب خانے میں ان کا ایک ایک نسخہ ہے۔ ایک سے زیادہ نسخے موجود نہیں۔ آپ مولوی شرف الدین تاجرانِ کتب عربیہ بھنڈی بازار کو لکھئے، وہ بھیج دیں گے۔ مَیں بھی کتابیں آج کل اُنہی کے یہاں سے منگواتا ہوں۔

۲۔ شہابِ ثاقب کے ''رجوما للشياطين'' (الملک:۵) ہونے کی نسبت دو باتیں پیشِ نظر رکھنی چاہئیں:

اوّلاً، کائنات ہستی کے جس قدر حوادث و اعمال ہیں، اُن کے علل و مقاصد کے بارے میں ہماری معلومات ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ یعنی اس حد سے جو ہمارے حواس کے تفحص وتعمق کی آخری حد ہے۔ اس حد سے آگے جو کچھ ہے وہ ہمارے لیے غیر معلوم و مجہول ہے اور جو کچھ غیر معلوم و مجہول ہے، اس کے لیے ہماری صحیح حیثیت یہی ہوسکتی ہے کہ عدمِ علم کا اعتراف کریں۔ منع ونفی کے مدعی نہیں ہو سکتے۔ مَیں اُمید کرتا ہوں بات آپ

پر واضح ہوگئی ہوگی۔ تشریح کی ضرورت نہیں۔ یوں سمجھئے کہ ایک خاص حد تک ہماری نظر و ادراک کے لیے روشنی ہے، اس کے بعد تاریکی ہے۔ جہاں سے تاریکی شروع ہوتی ہے، ہماری سیر نظری کے قدم رُک جاتے ہیں۔ اس کے بعد کیا ہے؟ کیا کچھ ہے اور کیا کچھ نہیں ہے۔ اس بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ اور اس لیے ہماری حیثیت صرف یہ ہے کہ عدم علم کا اعتراف کریں۔ کسی بات کے لیے نہ تو مثبت ہو سکتے ہیں، نہ مانع و منکر۔ قدیم و جدید عہد کے تمام اکابرِ علم و نظر نے صاف لفظوں میں اس کا اقرار کیا ہے۔

اب ایسا ہوتا ہے کہ علم و بیان کا ایک نیا دروازہ کھلتا ہے۔ ایک انسان وحی الٰہی کے ساتھ آتا ہے اور کہتا ہے جس حد کے بعد تمہارے لیے تاریکی ہے، میرے لیے روشنی ہے۔ جس حد کے بعد سے تمہارے لیے عدم علم ہے میرے لیے بصیرت و برہان ہے۔ جس حد کے بعد سے تمہارا سرمایۂ یقین ختم ہو جاتا ہے میری یقینیات شروع ہوتی ہیں۔ 'ھذہٖ سبیلی ادعو الی اللہ علی بصیرۃ انا و من اتبعنی.' (یوسف:۱۰۸) پس ایسی حالت میں ہمارے لیے علم اور راستی کی دو ہی راہیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ اگر وہ شخص اپنے تمام اقوال و اعمال میں صادق ہے تو اسے قبول کریں۔ کاذب ہے تو انکار کر دیں۔ لیکن وہ جو کچھ بیان کرتا ہے، اسے جھٹلا نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ جن حدود کے معاملات بیان کرتا ہے، ان کے لیے ہمارا مؤقف عدم علم کا ہے اور اس کا دعویٰ علم و بصیرت کا ہے۔ ہم وہاں کے لیے زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ شک سے زیادہ نہیں ہے۔ اور وہ جو کچھ کہتا ہے اس کی بنیاد علم و یقین ہے۔ ہم شک کی بناء پر علم و یقین کو جھٹلا نہیں سکتے۔ مختصر لفظوں میں جو کچھ کہہ دیا گیا ہے اگر آپ غور کریں گے تو نصف قرآن کی تفسیر ہے۔

۲۔ انبیاء کرام اور کتبِ سماویہ کے تمام بیانات جو ماورائے محسوسات سے تعلق رکھتے ہیں، اسی قسم میں داخل ہیں۔ یہ ایک خطرناک غلطی ہے کہ یہ حقیقت فراموش کر دی جائے اور غلط طریقوں سے تطبیق عقل و نقل کی کوشش کی جائے۔ یہاں تطبیق کی گنجائش ہی نہیں اور عقل اپنی حدود سے باہر سرے سے معلومات رکھتی ہی نہیں کہ معارفِ نقلیہ کے موافق ہوں یا مخالف

ہوں۔ عقل لاعلمی کے سکوت میں ہے۔ نقل علم و یقین کے ساتھ متکلم ہے۔ پس تعارض کب ہے کہ تطبیق کا سوال پیدا ہو؟

'شہاب ثاقب' وغیرہ کے متعلق بھی جس قدر امور بطریقِ صحیح کتاب و سنت سے ثابت ہیں، اسی قسم کے معارف میں داخل ہیں۔ بلاشبہ عقلِ انسانی نے ایک خاص حد تک پہنچ کر یہ بات معلوم کر لی ہے کہ شہابِ ثاقب کس طرح ٹوٹتے ہیں اور فضا میں کیا کیا محرکات ان کے سقوط کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ اس بات کے لیے علمِ انسانی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے بعد بھی کچھ ہے یا نہیں ہے؟ اور تمام تغیرات و حوادث عالم کی طرح اس حادثے میں بھی ماورائے نظر علم، افعال و خواص معنویہ پوشیدہ ہیں یا نہیں؟ پھر اگر وحی الٰہی نے اس بارے میں کچھ بتلایا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اسے تسلیم کریں کیونکہ اس کے خلاف ہمارے پاس کوئی علم و یقین موجود ہی نہیں ہے۔

یہ اصلِ عظیم پیشِ نظر رکھیے گا تو اس راہ کی تمام مشکلات حل ہو جائیں گی۔ یہ علم کلام متکلمین کا علمِ کلام نہیں ہے، کتاب و سنت کا کلام ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ بعض احادیث میں ''نجوم'' کی پیدائش کا مقصد بعض خاص امور بیان کیے گئے ہیں اور بقیہ کی نفی کی گئی ہے، تو اس بارے میں بھی ایک اصل پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ احادیث پر موقوف نہیں، خود قرآن میں بھی جا بجا اس طرح کی تصریحات موجود ہیں جن میں بعض اشیاء و مصنوعات کے مقاصدِ تخلیق بیان کیے گئے ہیں اور اسلوبِ بیان بظاہر مفید حصر ہے۔ مثلاً یہی تخلیقِ نجوم۔ یا مثلاً چاند کا گھٹنا بڑھنا۔ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ. (البقرۃ: ۱۸۹) وغیر ذالک۔ تو اگرچہ ان مقامات میں حصر پایا جاتا ہے، لیکن وہ علی الاطلاق نہیں ہے۔ خاص حالات سے مقید ہے اور یہ تقلید خود کتاب و سنت سے معلوم ہو جاتی ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت طرح طرح کے توہماتِ باطلہ مخالفین میں پھیلے ہوئے تھے اور اس وقت تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جہل و اصنام پرستی کی وجہ سے لوگ خیال کرتے تھے کہ اجرامِ سماویہ دیوتا ہیں اور باشندگانِ کرۂ ارض کے تمام نتائج و تاثرات کا سررشتہ ان ہی کے ہاتھ

میں ہے۔ بابل، یونان، مصر اور ہندوستان کا فنِ نجوم (جوتش) ان ہی عقائدِ باطلہ کا ایک مدون مجموعہ ہے۔ عرب جاہلیہ میں بھی یہ اوہام پھیلے ہوئے تھے۔ بس جہاں کہیں اجرامِ سماویہ کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں ان کی تخلیق کا کوئی ایسا مقصد بیان کر دیا گیا ہے، جو زیادہ واضح اور اقرب الی العقول ہے اور ساتھ ہی کہہ دیا گیا ہے کہ اس سے زیادہ جو کچھ سمجھا جاتا ہے، بے اصل ہے۔ یعنی جو خرافات لوگوں میں مشہور ہیں ان کی اصلیت نہیں۔ یہ مقصود نہیں ہے کہ ان کی تخلیق کے حقیقی مقاصد اس سے زیادہ نہیں ہیں۔ اَھِلَّة کی نسبت فرمایا ''ھِیَ مواقیت لِلنّاس''۔ کیونکہ یہ سب سے زیادہ واضح اور اوقع فی النفس بات تھی۔ مقصود یہ تھا کہ تم نے چاند کے گھٹنے بڑھنے اور مہینوں کی چاند رات کی نسبت جس قدر اوہام وخرافات بنا رکھے ہیں، ان کی کوئی اصلیت نہیں۔ یہ تو اوقات معلوم کرنے کا سامان ہے اور بس۔

حضرت ابراہیم کی وفات اور کسوفِ مدینہ والی حدیث پر نظر ڈالیے، صرف اتنی بات پر کسوف کا معاملہ ختم کر دیا گیا کہ آیاتِ الٰہیہ میں سے ایک آیت ہے اور تمام تر زور عوام کے بے اصل خیالات کے ازالے پر دیا گیا۔ کیونکہ انبیائے کرام کا مقصود اصلاحِ عقائد ہوتا ہے نہ کہ خواص وفوائد اجسام کی شرح وتنقیب۔

بہرحال جس حدیث کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ اس میں نفی مطلق نہیں مقید ہے۔

سماء الدنیا سے مقصود بلندی کا وہ نظارہ ہے جو ہمیں اپنی نگاہوں کے سامنے نظر آتا ہے۔ یعنی فضاء جسے یونانی اور اب اس کی وجہ سے انگریزی میں (ایتھا سفیر) کہتے ہیں۔ عربی میں سماء کے معنی اوپر کی چیز کے ہیں۔ المثل مثل السائر میں آپ نے پڑھا ہوگا:

واحمر کالدیباج اما سماؤہ

فریاد و اما ارضہ فمخول

پس سماء الدنیا کے معنی ہوئے زمین کے اوپر کی فضا۔

مولوی افضال الحق[۱] صاحب کو اور اگر ملاقات ہو تو ان کے والدِ بزرگوار کو میرا سلامِ شوق پہنچا دیں۔ (ابوالکلام)

حاشیہ

[۱] مولوی افضال الحق صاحب اور ان کے والد مولانا فضل حق صاحب رام پور کے رہنے والے تھے۔ مولانا فضل حق صاحب رام پور کی ایک زمانے میں مشہور عالم علومِ مشرقی کی درسگاہ، اورینٹل کالج کے پرنسپل تھے اور بعد میں افضال الحق صاحب بھی اسی کالج میں استاد ہو گئے تھے۔ مولانا فضل حق صاحب منطق اور فلسفے کے جید عالم تھے اور اپنے عہد کے ہندوستان میں ان کا نام سند کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۰ء میں وفات پائی۔ متعدد اہم کتابیں ان کی تصنیف ہیں۔ مولوی افضال الحق صاحب کے والد مولوی فضل حق صاحب تو ان دیوزاد عالموں کے سلسلے کی آخری کڑی تھے جس میں عبدالحق خیرآبادی، فضل حق خیرآبادی اور ان سے اوپر شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب جیسے لوگ گذر چکے تھے۔

نیا دَور دہلی، جولائی ۱۹۶۲ء